© rasailojaraid.com

آئین کی آٹھویں ترمیم اور جونیجو حکومت

کوثر پروین

آئین ان عمومی اصولوں کا مجموعہ ہوتا ہے جو ایک معاشرے کے نظام کو چلاتے ہیں یہ اداروں کی ساخت بھی بیان کرتا ہے جو ریاست، قوانین اور روایات کو چلاتے ہیں اور ان اداروں اور ان کے باہمی تعلقات کے لیے راہنمائی مہیا کرتے ہیں[1]۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو آئین لوگوں کی زندگی کے مقاصد اور خواہشات کی ترجمانی نہیں کرتا وہ لوگوں کی راہنمائی نہیں کرسکتا۔

ایک آئین عموماً ریاست کے مختلف حصوں قانون ساز اسمبلی، انتظامیہ اور عدلیہ کے درمیان تقسیم کار مہیا کرتا ہے۔ قانون ساز اسمبلی قانون بناتی ہے، عدلیہ ان قوانین کی تشریح کرتی ہے اور انتظامیہ کا کام یہ ہوتا ہے کہ ان قوانین اور ریاستی پالیسی کو نافذ کرے۔ آئین کے اندر نظام حکومت پارلیمانی بھی ہوسکتا ہے اور صدارتی بھی۔ پارلیمانی نظام میں انتظامی طاقت کا استعمال وزیروں کی ایک منتخب کابینہ کرتی ہے جس کا سربراہ وزیراعظم ہوتا ہے جو قانون ساز اسمبلی میں اکثریتی پارٹی کا لیڈر ہوتا ہے۔ برطانیہ، انڈیا، اور پاکستان میں پارلیمانی نظام رائج ہے۔ صدارتی نظام میں انتظامیہ کا سربراہ پانچ سال کے لیے براہ راست عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوتا ہے۔ صدارتی نظام کی بہترین مثال امریکہ ہے۔ لہذا ایک آئین ہی حکومت کی نوعیت اور ریاست کے تینوں اداروں کے باہمی تعلقات کی وضاحت کرتا ہے۔ آئین اور آئین کے مختلف حصے مختلف مفادات کی حفاظت کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آئین کا کوئی آرٹیکل یا شق عوام کی ضروریات سے مطابقت نہیں رکھتی جس سے اس آئین میں تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے۔

آئین میں تبدیلی ایک ترمیم کے ذریعے کرائی جاتی ہے۔ لیکن یہ آئینی تبدیلی صرف اس طریقہ کار کے مطابق لائی جاسکتی ہے جو اس آئین میں درج ہوتا ہے۔ اگر ایک آئین میں تبدیلی کا طریقہ کار آسان ہو تو اسے لچکدار آئین کہا جاتا ہے اور اگر آئین میں ترمیم کار پیچیدہ یا ناممکن ہو تو اسے غیر لچکدار آئین کہا جاتا ہے۔ ایک آئین کو نا تو اتنا غیر لچکدار ہونا چاہیے کہ تبدیلی کی راہ میں رکاوٹ بنے اور نہ اتنا لچکدار ہو کہ اس میں اس حد تک تبدیلیاں کر دی جائیں کہ اس کا بنیادی کردار ہی بدل جاوے۔ آئین میں یہ خوبی ہونی چاہیے کہ اس میں عوام کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور حالات کے مطابق تبدیلی کی جاسکے۔ آئین کے اندر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ترامیم ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آئین میں ہونے والی کوئی ترمیم عوام کی توجہ کا مرکز اور بحث ومباحثہ کا باعث بن جاتی ہے جیسا کہ پاکستان میں آٹھویں ترمیم کے معاملے میں ہوا۔ آٹھویں ترمیم پاکستان کی آئینی تاریخ میں ہونے والی تمام ترامیم سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیادہ موضوع بحث بنی اور اب تک بنی ہوئی ہے۔اب بھی آٹھویں ترمیم کے کچھ حصوں کو کسی نہ کسی صورت میں بحال کرنے پر غور کیا جارہا ہے۔

پاکستان کی آئینی تاریخ اس لحاظ سے لاثانی ہے کہ اس میں تین آئین اور کافی تعداد میں عبوری آئین تشکیل دیئے گئے۔ پاکستان ایک پنڈولم کی طرح پارلیمانی اور صدارتی نظاموں کے درمیان جھولتا رہا۔جس کے نتیجے میں سول اور ملٹری بیوروکریسی اور جمہوری اداروں کے درمیان تعلقات میں عدم استحکام پیدا ہوا[۲]۔ اکثر اوقات آئین میں ترامیم ذاتی مفادات کے حصول کے لیے کی گئیں۔عدلیہ نے بھی بیشتر معاملات میں حکمرانوں کا ساتھ دیا[۳]۔ پاکستان کا پہلا آئین ۱۹۵۶ء میں بنا جس میں پارلیمانی نظام حکومت تجویز کیا گیا تھا۔۱۹۶۲ء کے دوسرے آئین میں صدارتی نظام کو متعارف کرایا گیا۔دونوں آئینوں میں متعلقہ نظام حکومت کے بنیادی اصولوں کو خاطر خواہ اہمیت نہ دی گئی[۴]۔مثلاً ۱۹۵۶ء کے آئین میں گورنر جنرل کو وزیراعظم کے مقابلے میں زیادہ اختیارات دیئے گئے جو پارلیمانی نظام حکومت کی روح کے منافی تھا۔۱۹۶۲ء کے آئین میں نگرانی وتوازن (Checks & Balances) کا نظام موجود نہ تھا جو کہ صدارتی نظام کی بنیادی خصوصیت ہے۔جس کا نتیجہ دونوں آئینوں کی ناکامی کی صورت میں نکلا[۵]۔ان دونوں آئینوں کے مقابلے میں تیسرا آئین جو ۱۹۷۳ء میں بنایا گیا وہ زیادہ جمہوری تھا۔یہ آئین ایک براہ راست منتخب ہونے والی اسمبلی نے پاس کیا جس پر مکمل بحث کی گئی۔قومی اسمبلی میں موجود تمام سیاسی جماعتوں نے متفقہ طور پر اسے پاکستان کا آئین تسلیم کیا لہٰذا اسے پوری قوم کی حمایت حاصل تھی[۶]۔ بدقسمتی سے ۱۹۷۳ء کے آئین کا حلیہ بگاڑنے کا آغاز خود اس کے معمار ذوالفقار علی بھٹو نے کیا جنہوں نے آئین میں ترامیم کے ذریعے عدلیہ کے اختیارات کو کم کرنے کی کوشش کی[۷]۔اس کے بعد ضیاء الحق نے مارشل لاء کے تاوان میں آٹھویں ترمیم پاس کروائی۔اس آئینی ترمیم نے آئین کی ساخت اور نوعیت میں بنیادی تبدیلیاں کیں[۸]۔آٹھویں ترمیم کی حمایت کرنے والوں کا مؤقف تھا کہ یہ صدر اور وزیراعظم کے درمیان طاقت کا توازن پیدا کرتی ہے۔اس کے مخالفین کا کہنا تھا کہ صدر کو زیادہ اختیارات دے کر اسے زیادہ طاقت ور بنا دیا گیا ہے[۹]۔کچھ لوگوں نے اسے ۱۹۷۷ء میں ہونے والے واقعات کا فطری نتیجہ قرار دیا جب کہ کچھ لوگوں نے اس آئینی ترمیم کے طریقہ کار پر اعتراض کیا۔درحقیقت آٹھویں ترمیم محض ایک ترمیم نہ تھی بلکہ یہ پارلیمانی اور صدارتی نظام کا ایک ملغوبہ تھی۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ آٹھویں ترمیم صرف چند آرٹیکل پر مشتمل ہے جو صدر کو اپنی صوابدید پر قومی اسمبلی کو برطرف کرنے کا اختیار دیتی ہے درحقیقت یہ ایک ضخیم دستاویز ہے جس نے تقریباً ۶۷ آرٹیکلز کو تبدیل کیا۔بظاہر آٹھویں ترمیم کے اندر ۱۷ آرٹیکلز کی ترمیم کی گئی۔مگر حقیقت میں آٹھویں ترمیم نے جنرل ضیاء الحق کی پہلے آئین میں ایک بڑی تعداد میں کی گئی آئینی ترامیم کو جائز قرار دے دیا[۱۰]۔لیکن اس کا سب سے اہم آرٹیکل ۵۸۔۲۔بی ہے جس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے صدر اور وزیر اعظم کے درمیان طاقت کا توازن صدر کے حق میں ہو گیا۔

صدر اور وزیر اعظم کے درمیان اختیارات کی تقسیم:

۱۹۷۳ء کا آئین پارلیمانی تھا جس میں وزیر اعظم انتظامیہ کا سربراہ ہوتا ہے۔ پارلیمانی نظام میں اختیارات کی تقسیم میں تین اجزاء اہم ہیں۔

۱۔ صدر کا کردار

۲۔ قانون ساز اسمبلی اور انتظامیہ کے تعلقات

۳۔ کابینہ اور وزیر اعظم کے تعلقات[11]

پارلیمانی نظام میں صدر ایک رسمی سربراہ ہوتا ہے جب کہ اختیارات کا منبع وزیر اعظم کی ذات ہوتی ہے جو اپنی کابینہ کے ساتھ مل کر حکومت کرتا ہے صدر قانونی طور پر تمام اختیارات رکھتا ہے مگر عملی طور پر وہ ان اختیارات کا استعمال نہیں کرتا "Bagehot" بیگہوٹ کہتا ہے ''ایک بادشاہ کے تین حقوق ہیں یہ کہ اس سے مشورہ کیا جائے، وہ حوصلہ افزائی کرے اور خبردار کرے۔ ایک عقلمند بادشاہ اس سے کچھ زیادہ کا خواہشمند نہیں ہوتا''[12]۔ سیاسی طور پر حساس فیصلے مثلاً اسمبلی کی برطرفی وغیرہ وزیر اعظم کے مشورے سے کیے جاتے ہیں[13]۔ پارلیمانی نظام میں طاقت کا سرچشمہ اسمبلی ہوتی ہے۔ وزیروں کی کابینہ اس اسمبلی سے چنی جاتی ہے اور وہ اس اسمبلی کے سامنے ہی جواب دہ ہوتی ہے۔ حکومت اس وقت تک اقتدار میں رہتی ہے جب تک اسے اسمبلی کا اعتماد حاصل ہوتا ہے اگر یہ اعتماد ''عدم اعتماد'' کی تحریک کے ذریعے ختم ہو جائے تو حکومت سے استعفیٰ کی توقع کی جاتی ہے۔ اگر ایسی حکومت تشکیل نہ دی جا سکے جسے اسمبلی کا اعتماد حاصل ہو تو عام طور پر اسمبلی کو برطرف کرنے کے بعد عام انتخابات کا انعقاد کیا جاتا ہے[14]۔ وزیر اعظم کو اپنے وزراء کی تقرری اور برطرفی کے مکمل اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ وزیر اعظم اپنی کابینہ سمیت مجموعی طور پر اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے[15]۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں صدر ریاست کا سربراہ تھا مگر آٹھویں ترمیم کے بعد صدر کی پوزیشن میں درج ذیل انقلابی تبدیلی آئی تھی۔

۱۔ وہ ریاست کا سربراہ تھا۔

۲۔ وفاق کے انتظامی اختیارات صدر کے پاس تھے جو ان کو براہ راست یا اپنے ماتحت افسروں کے ذریعے استعمال کر سکتا ہے۔

۳۔ وفاقی حکومت کے تمام انتظامی معاملات صدر کے پاس تھے۔

۴۔ وہ پارلیمنٹ کا لازمی حصہ تھا۔

۵۔ وہ مسلح افواج کا سپریم کمانڈر بھی تھا[16]۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے علاوہ صدر اور وزیر اعظم کے درمیان معاملات کے تین دائرہ کار تھے۔ پہلی قسم کے آرٹیکلز وہ تھے جن کے تحت صدر کو "صوابدید" حاصل تھی یہاں صدر وزیر اعظم سے مشورہ لے سکتا تھا لیکن نہ تو وہ مشورہ لینے کا پابند تھا اور نہ ہی اس مشورے پر عمل کرنے کا پابند تھا۔ دوسری قسم کے آرٹیکلز میں صدر مشورہ لینے اور اس پر عمل کرنے کا پابند تھا[17]۔ تیسری قسم کے آرٹیکلز میں نہ تو صوابدید کا ذکر تھا اور نہ مشورہ لینے اور اس پر عمل کرنے کا[18]۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں کہا گیا "آئین کے تابع، وفاق کا عاملانہ اختیار صدر کے نام سے، وفاقی حکومت استعمال کرے گی جو وزیر اعظم اور وفاقی وزراء پر مشتمل اور وزیر اعظم کے توسط سے عمل پیرا ہوگی جو وفاق کا انتظامی سربراہ اعلیٰ ہوگا"۔ لیکن آٹھویں ترمیم کے بعد اس آرٹیکل کو اس طرح تبدیل کیا گیا۔ "وفاق کا عاملانہ اختیار صدر کو حاصل ہوگا اور وہ اسے یا تو براہ راست خود یا اپنے ماتحت افسروں کے ذریعے دستور کے بموجب استعمال کرے گا"۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "عاملانہ اختیار" وزیر اعظم سے چھین لینے کے بعد اسے ایک کم تر حیثیت دی گئی۔

۱۹۷۳ء کے آئین میں صدر کے دستخط بس ایک تکلف تھے آٹھویں ترمیم کے بعد آئین میں درج ہے"
جب کوئی بل منظوری کے لئے صدر کو پیش کیا جائے، تو صدر تیس دن کے اندر
(ا) بل کی منظوری دے دے گا یا
(ب) کسی ایسے بل کی صورت میں جو مالی نہ ہو، بل کو اس پیغام کے ساتھ مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) میں واپس کر دے گا کہ بل پر یا اس کے کسی مصرحہ حکم پر، دوبارہ غور کیا جائے اور پیغام مصرحہ کی ترمیم پر غور کیا جائے"۔ اس آرٹیکل نے پارلیمنٹ کی پوزیشن کو خاصا کم کر دیا اور صدر کو زیادہ جوڑ توڑ کرنے کا موقع مل گیا[19]۔ آٹھویں ترمیم کے بعد آرٹیکل ۴۸ (۲) کہتا ہے "صدر کسی ایسی معاملے کی نسبت جس کے بارے میں دستور کی رو سے اسے ایسا کرنے کا اختیار دیا گیا ہے اپنی صوابدید پر عمل کرے گا [20] (ور کسی ایسی چیز کے جواز پر جو صدر نے اپنی صوابدید پر کی ہو اور اس کی وجہ سے خواہ کچھ بھی ہو اعتراض نہیں کیا جائے گا)"۔ اس سے ایسا لگتا ہے کہ صدر کی صوابدید کو لامحدود کر دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ آئین کے پارلیمانی کردار اور جوابدہی کی ضرورت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی[21]۔ سپریم کورٹ نے اس کی اس طرح وضاحت کی ہے؛

"Absolute,unchallengeable and unlimited power is not available to an individual how ever high place he may occupy"[22]

سپریم کورٹ نے صدر کے صوابدیدی اختیارات پر کچھ پابندیاں لگائیں۔ حاجی سیف اللہ خان کیس میں سپریم کورٹ نے کہا:

" The discretion or the formation of the opinion had to be based on facts

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

and reasons which are objective realities. The discretion of formation of opinion cannot be based on illusions,fancy,or whim.(if the authority,power or discretion were not absolute to be) free from reason and absolute, it will partake of the omnipotent which is inpermissible to a mortal however high he may be".[۲۳]

آرٹیکل (۱) ۴۸ میں کی گئی ترمیم بھی صدر کے حق میں جاتی ہے اصل آرٹیکل میں ہے۔''اپنے فرائض کی انجام دہی میں صدر، وزیراعظم کے مشورے سے اور اس کے مطابق عمل کرے گا اور مذکورہ مشورے کی پابندی اس پر لازم ہو گی''۔ترمیم کے بعد یہ آرٹیکل کہتا ہے''اپنے کارہائے منصبی کی انجام دہی میں صدر، کابینہ یا وزیراعظم کے مشورے کیمطابق عمل کرے گا''اس طرح اس آرٹیکل میں کابینہ یا وزیراعظم کے اضافے سے ان دونوں میں اختلاف کو ظاہر کرنا مقصود ہے جس سے صدر فائدہ اٹھا سکتا ہے حالانکہ پارلیمانی نظام میں کابینہ اور وزیراعظم جدا جدا نہیں ہیں۔وزیراعظم ہی کابینہ کا واحد ترجمان ہے۔ان شقوں کو آئین میں شامل کرنے کا صاف مطلب ہے کہ صدر کو اپنی لابی بنانے کا موقع دیا جائے[۲۴]۔آرٹیکل ۴۶ میں کچھ اس طرح ترمیم ہوئی کہ اصل آرٹیکل کو بالکل ہی تبدیل کر دیا گیا۔اصل آرٹیکل اس طرح تھا'' وزیراعظم ،صدر کو داخلی اور خارجی پالیسی کے معاملات اور قانون سازی کی تمام تجاویز سے جو وفاقی حکومت پارلیمنٹ کے سامنے لانا چاہتی ہو آگاہ رکھے گا''اس آرٹیکل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ صدر کو انتظامی معاملات میں عملی مداخلت کی حوصلہ افزائی کئے بغیر تمام بڑے انتظامی فیصلوں کے بارے میں آگاہ کیا جائے۔ترمیم شدہ آرٹیکل کہتا ہے۔''ورزیراعظم کا فرض ہوگا کہ وہ

(ا) صدر کو وفاق کے امور کے انتظام اور قانون سازی کی تجویزوں سے متعلق فیصلوں کی اطلاع دے۔

(ب) وفاق کے امور کے انتظام اور قانون سازی کی تجویزوں سے متعلق ایسی اطلاع فراہم کرے جو صدر طلب کرے۔

(ج) صدر کے ایما پر کابینہ کے غور کے لئے کوئی ایسا معاملہ پیش کرے جس سے متعلق وزیراعظم یا کسی وزیر نے فیصلہ کر لیا ہو لیکن جس پر کابینہ نے غور نہ کیا ہو۔وزیراعظم کے لئے'فرض' کا لفظ استعمال کرنے سے اس کی کمزور پوزیشن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔درحقیقت وزیراعظم صدر کو نہیں بلکہ پارلیمنٹ کو جوابدہ ہوتا ہے اس سے وزیراعظم کی پوزیشن کابینہ میں بھی کمزور ہو جاتی ہے[۲۵]۔آرٹیکل (۲) ۹۱ میں کہا گیا''صدر اپنی صوابدید کے مطابق قومی اسمبلی کے اراکان میں سے ایک وزیراعظم مقرر کرے گا جس کے قومی اسمبلی کے اراکان کی اکثریت کا اعتماد حاصل کرنے کا اس کی رائے میں زیادہ سے زیادہ امکان ہو''[۲۶]۔اگرچہ یہ شق ۲۰ مارچ ۱۹۹۰ء تک تھی پھر بھی اس شق نے ۱۹۷۳ء کے آئین کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بحالی کے بعد دو انتخابات میں صدر کو یہ اختیار دیا کہ اپنی پسند کا وزیر اعظم چنے لیکن اس آرٹیکل میں یہ نہیں بتایا گیا کہ کس طریقہ کار سے صدر یہ اخذ کرے گا کہ وہ شخص جس کو وزیر اعظم نامزد کیا جا رہا ہے اکثریت رکھتا ہے۔ پارلیمانی نظام میں قانون ساز اسمبلی کا حق ہے کہ وہ اپنا لیڈر منتخب کرے۔

آٹھویں ترمیم کا سب سے اہم اور سب سے زیادہ موضوع بحث بننے والی ترمیم آرٹیکل ۵۸ (بی۔۲) ہے۔ ''صدر اپنی صوابدید پر قومی اسمبلی کو توڑ سکے گا جب کہ اس کی رائے میں

(ا) وزیر اعظم کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ منظور کئے جانے کے بعد قومی اسمبلی کے کسی رکن کا دستور کے احکام کے مطابق قومی اسمبلی کے اراکان کی اکثریت کا اعتماد رکھنے کا امکان نہ ہو جس طرح کہ اس غرض سے طلب کردہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں معلوم ہو یا

(ب) ایسی صورتحال پیدا ہوگئی ہو جس میں وفاق کی حکومت دستور کے احکام کے مطابق چلائی نہ جا سکتی ہو اور انتخاب کنندگان سے رائے لینا ضروری ہو۔

آرٹیکل میں یہ نہیں بتایا گیا کہ کس طرح صدر یہ اخذ کرے گا کہ وفاق کی حکومت آئین کے مطابق چلائی جا رہی ہے یا نہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ ذاتی رائے پر مبنی ہوگا[۲۷]۔ قومی اسمبلی کے ایک ممبر نے اس کے ایک اور پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ''ایک ہی وقت میں دو لوگوں کو ایک قسم کی طاقت دینا تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے جیسا کہ صدر اور وزیر اعظم کو بیک وقت اسمبلی توڑنے کا اختیار دے دیا گیا''۔ اس سے پارلیمنٹ بھی ہمیشہ دباؤ کا شکار رہے گی کیونکہ دو افراد کے پاس اس کو توڑنے کا اختیار تھا۔ اسمبلی توڑنے کا اختیار وزیر اعظم کے پاس ہی ہونا چاہیے کیونکہ وہ پارلیمنٹ کا حصہ اور نمائندہ ہے اور پارلیمنٹ نے اس پر اعتماد کیا ہے[۲۸]۔ درحقیقت صدر جو خود اسمبلی کی تخلیق تھا اس کو بغیر کسی جوابدہی کے خوف کے توڑ سکتا تھا۔ مثلاً اگر صدر کا فیصلہ سپریم کورٹ غلط بھی قرار دے دیتی تو صدر بغیر کسی سزا کے اپنے عہدے پر برقرار رہ سکتا تھا۔ اس کے برعکس جب ایک منتخب وزیر اعظم صدر کو اسمبلی توڑنے کا مشورہ دیتا ہے تو اسے وزیر اعظم کے عہدے سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ اور عوام کا دوبارہ سامنا کرنا پڑتا ہے[۲۹]۔ یہ آرٹیکل واضح طور پر پارلیمنٹ کی خود مختاری کو محدود کرتا ہے اور تمام نظام کو ایک آدمی کی صوابدید پر چھوڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایک آئینی ماہر کہتا ہے کہ ''موجودہ صدارتی عہدہ کسی آئینی مطلق العنانیت سے کم نہیں''[۳۰]۔ صدر کے صوابدیدی اختیارات میں اضافہ وزیر اعظم کے اختیارات پر ناجائز قبضے کے مترادف تھا۔ دو لوگوں کو ایک ہی طاقت دینے کا مطلب ہے کہ طاقت کے دو مراکز بنائے جائیں جس سے سیاسی سازشوں اور طاقت کے لئے رسہ کشی شروع ہو جائے گی۔ اس سے جو سیاسی غیر یقینی صورتحال پیدا ہوتی ہے وہ لمبے عرصے کی قومی پالیسیاں بنانے میں رکاوٹ بنتی ہے۔ پاکستان میں ملکی نظام کو Troika کے ذریعے چلایا جاتا ہے جس میں ہر ایک اپنی طاقت اور اختیار کو بڑھانے کے چکر میں ہوتا ہے۔ اسی صورت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں آٹھویں ترمیم نے تین اعلیٰ ترین عہدوں صدر، وزیر اعظم اور افواج کے سربراہ کے درمیان ٹکراؤ اور اختلاف کو ہوا دی۔ یہ کسی بھی لحاظ سے اختیارات کے توازن کا مناسب حل نہ تھی[۳۱]۔

آرٹیکل ۵۸ کی پہلی شق ترمیم سے زیادہ بہتر ہوگئی۔ ''صدر قومی اسمبلی توڑ دے گا اگر وزیر اعظم اسے بایں طور مشورہ دے اور قومی اسمبلی، تاوقتیکہ اس سے قبل برخاست نہ کر دی گئی ہو، وزیر اعظم کی طرف سے بایں طور پر مشورہ دئے جانے کے بعد اڑتالیس گھنٹوں کے خاتمے پر برخاست ہو جائے گی''۔ اس کی مزید وضاحت کی گئی کہ ''اس آرٹیکل میں 'وزیر اعظم' کے حوالے میں کسی ایسے وزیر اعظم کا جس کے خلاف قومی اسمبلی میں (عدم اعتماد کے ووٹ کے لئے قرارداد کا نوٹس دے دیا گیا ہو) لیکن اس پر رائے دہی نہ کی گئی ہو جس کے خلاف ایسی کوئی قرارداد منظور کی جا چکی ہو یا جو استعفیٰ دینے کے بعد یا قومی اسمبلی برخاست ہو جانے کے بعد اس عہدہ پر برقرار ہو حوالہ شامل نہیں سمجھا جائے گا''۔ اصل آرٹیکل میں درج تھا کہ قومی اسمبلی توڑی نہیں جائے گی جہاں اگر وزیر اعظم کے خلاف عدم اعتماد کے ووٹ کی قرارداد اسمبلی میں پیش کی جا چکی ہو۔ اسی ترمیم نے آرٹیکل کو زیادہ قابل عمل بنا دیا۔ اس معاملے میں بھی جہاں اس قسم کی قرارداد کا ایک نوٹس بھی دیا گیا جہاں ایک وزیر اعظم کا نمائندہ کردار مشکوک ہو وہاں یہ قومی اسمبلی کی تحلیل کی راہ میں رکاوٹ تھی۔

مندرجہ بالا آرٹیکلز سے ثابت ہوتا ہے کہ وزیر اعظم کے لئے ان حالات میں کام کرنا کس قدر مشکل تھا، یہی وجہ ہے کہ ایک قلیل عرصے میں چار مرتبہ قومی اسمبلی توڑی گئی اور حکومتیں برطرف ہوئیں۔ اس مضمون میں آٹھویں ترمیم کے پہلے شکار جونیجو حکومت کا جائزہ لیا جائے گا۔ جس سے اس نئے نظام کے ناقابل عمل ہونے اور نظام حکومت میں پیدا ہونے والی دشواریوں کا پتا چلتا ہے۔

جونیجو حکومت ۱۹۸۵ء۔۱۹۸۸ء

۱۹۸۵ء میں ہونے والے انتخابات کے نتیجے میں پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس ۳ مارچ ۱۹۸۵ء کو ہوا۔ ضیاء الحق نے صدر کے طور پر پانچ سال کے لئے حلف اٹھایا اور محمد خان جونیجو کو پاکستان کا وزیر اعظم نامزد کیا[۳۲]۔ بقول محمد وسیم:

"He was selected apparently for being non-controversial, non-assertive and non-committal on national issues"[۳۳]

بعد میں اسمبلی نے محمد خان جونیجو کو اعتماد کا ووٹ دیا۔ جلد ہی اسمبلی دو گروپوں میں تقسیم ہوگئی ان میں ایک آزاد اور پارلیمانی گروپ اور دوسرا سرکاری پارلیمانی گروپ تھا۔ اسمبلی نے آغاز ہی سے ملک کو درپیش آئینی اور سیاسی معاملات پر اظہار خیال کرنا شروع کر دیا۔ پارلیمنٹ نے اپنی خود مختاری کا ثبوت سید فخر امام کو ضیاء الحق کے امیدوار کے مقابلے میں کامیاب کروا کر دیا۔ پارلیمنٹ نے مجموعی طور پر قومی معاملات پر بات کرنے کے لئے ایک مفید فورم کا کام کیا تھوڑے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عرصے میں ہی قومی اسمبلی نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک ربڑ سٹیمپ نہیں ہے[۳۴]۔ اسمبلی کے لئے سب سے بڑا اور فوری چیلنج اپنا اعتبار قائم کرنا تھا۔ ملک میں مارشل لاء نافذ تھا لہذا اسمبلی نے مارشل لاء کو ختم کرنے کی قراردادیں پیش کیں۔ اس طرح تینوں صوبائی اسمبلیوں سندھ، سرحد اور پنجاب نے بھی مارشل لاء کو ختم کرنے کی قراردادیں پاس کیں۔ نتیجۃً محمد خان جونیجو نے ۱۴ اگست کو اعلان کیا کہ مارشل لاء ۱۹۸۵ء کے آخری دن اٹھا لیا جائے گا۔ اور اس اعلان کے مطابق ۳۰ دسمبر ۱۹۸۵ء کو مارشل لاء اٹھا لیا گیا[۳۵]۔ ۱۹۸۶ء کے آغاز میں مارشل لاء اور ایمرجنسی ختم ہو چکے تھے اور بنیادی حقوق بحال کر دیے گئے تھے۔ آہستہ آہستہ جونیجو حکومت کے اعتماد اور مقبولیت کا گراف بڑھتا گیا۔ اس دوران ضیا الحق سیاسی منظر سے قدرے دور رہے[۳۶]۔ جیسے ہی جونیجو حکومت نے مرکز اور صوبوں میں حکومتیں تشکیل دیں اور پارلیمانی نظام نے کام کرنا شروع کیا تو سیاسی جماعتوں کی ضرورت کا احساس شدت سے ہونا شروع ہو گیا۔ لہذا جونیجو نے اپنی سیاسی جماعت بنانے کا فیصلہ کیا اور خود اس جماعت مسلم لیگ کے صدر بن گئے۔ پارلیمنٹ کے اندر سرکاری پارلیمانی گروپ کے ارکان مسلم لیگ میں شامل ہو گئے[۳۷]۔ لیکن جونیجو ایک مشکل میں پھنس گئے۔ وہ اسی وقت پارٹی کے رکن بن گئے جب کہ وہ ابھی رجسٹر بھی نہیں ہوئی تھی۔ جونیجو کو اس مشکل سے نکالنے کے لئے ضیا الحق نے ایک آرڈیننس کے ذریعے مارشل لاء کے تحت سیاسی جماعتوں کے ایکٹ میں ترمیم کر دی[۳۸]۔ سیاسی عمل کی بحالی کے بعد بھی ضیا الحق دفاعی اور خارجی امور میں پالیسیوں کی تشکیل کرتے رہے۔ درحقیقت ۱۹۸۵ء کے بعد جو نظام پاکستان میں بنا وہ فوج اور منتخب نمائندوں کے درمیان طاقت کی شراکت کا نظام تھا۔ جس میں ۱۹۷۳ء کے آئین کو ایک پردے کے طور پر استعمال کیا گیا[۳۹]۔

جونیجو اور ضیا الحق اپنے سیاسی انداز اور مزاج میں بالکل مختلف تھے۔ ان کی ذاتی امنگیں اور نئے سیاسی نظام میں اپنے اپنے کردار کے متعلق ان کے تصورات بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ وہ اختیارات کی تقسیم کس طرح کریں اور اپنے مفادات کے ٹکراؤ کو ختم کریں۔ آٹھویں ترمیم نے حکومت کے معمول کے کاموں کو بھی بہت پیچیدہ بنا دیا تھا[۴۰]۔ خاص طور پر صدر کے چیف آف دی آرمی سٹاف کا عہدہ اپنے پاس رکھنے کی وجہ سے سیاسی ادارے دباؤ میں آ گئے۔ بلکہ یہ ایک دھمکی محسوس ہوتی تھی کہ اگر ان کے متعین کردہ راستے سے ہٹنے کی کوشش کی گئی تو اس کی سزا بھی مل سکتی ہے[۴۱]۔ جونیجو ایک کٹھ پتلی وزیر اعظم نہیں بننا چاہتے تھے۔ وہ آئین کے مطابق حکومت کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جونیجو اور ضیا الحق دونوں چھوٹے چھوٹے معاملات میں الجھ گئے۔ جونیجو اپنے عہدے کی رسمی شان و شوکت چاہتے تھے۔ وہ اس شان و شوکت کو عوامی سطح پر وزیر اعظم کی طاقت کی ایک علامت سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ جونیجو ایک نامزد وزیر اعظم کی بجائے ایک منتخب وزیر اعظم کے طور پر اپنے آپ کو منوانا چاہتے تھے۔ اس بات نے پہلے دن سے ہی جونیجو اور ضیاء الحق کے درمیان اختلافات پیدا کر دیے۔ آغاز میں یہ اختلافات پس پردہ رہے مگر یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اتنے مضبوط تھے کہ زیادہ دیر تک چھپ نہیں سکتے تھے[42]۔ جونیجو ذوالفقار علی بھٹو کی طرح طاقتور وزیراعظم بننا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی حیثیت منوانے کے لئے بڑی مستقل مزاجی دکھائی۔ جس سے صدر اور وزیراعظم کے تعلقات میں تناؤ پیدا ہوا[43]۔ ۱۹۸۸ء تک یہ افواہیں گردش میں تھیں کہ صدر اور وزیراعظم کے درمیان بنیادی اختلافات موجود ہیں۔ عام طور پر محسوس کیا جاتا تھا کہ صدر جنہوں نے آٹھ سال تک بلا شرکت غیرے حکومت کی ہے وہ اب ذہنی طور پر کسی کے ساتھ شراکت پر تیار نہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ تھا کہ جونیجو کی غلطی تھی کہ انہوں نے چھوٹے چھوٹے معاملات پر خواہ مخواہ صدر کو ناراض کیا۔ جونیجو نے یہ محسوس نہیں کیا کہ اس طاقت کی شراکت کے نئے نظام میں ان کی حیثیت ایک چھوٹے حصہ دار کی طرح ہے[44]۔

پارلیمانی روایات کے برعکس صدر ضیاالحق مسلسل پارلیمنٹ کو اسلام کے نظام کے نفاذ میں اور عام آدمی کے لئے بہتر نظام وضع کرنے میں ناکامی پر تنقید کرتے رہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے پارلیمنٹ سے اپنے خطاب کے دوران قومی اسمبلی کو بلواسطہ طور پر خبردار بھی کیا۔ ضیاالحق نے کبھی سیاست اور سیاست دانوں سے اپنی نفرت کے اظہار میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ قومی اسمبلی کے ممبران نے جوابی کاروائی کے طور پر مارشل لاء حکومت کی ناکامیاں گنوانا شروع کر دیں۔ اس سارے معاملے نے لوگوں کے ذہنوں میں الجھن پیدا کی اور موجودہ نظام کی کامیابی کے بارے میں شکوک وشبہات کو جنم دیا[45]۔ اس کا نتیجہ صدر کے ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کے اعلان کی صورت میں برآمد ہوا۔ جس میں ضیا الحق نے اسمبلی توڑ دی اور آٹھویں ترمیم کے آرٹیکل ۵۸ (بی۔۲) کے مطابق وزیراعظم کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا۔ اخبارات نے اسے آئینی بغاوت کا نام دیا۔ صدر نے حکومت کی برطرفی کا اعلان کرتے ہوئے یہ کہا کہ قومی اسمبلی کے ممبران کرپشن میں ملوث ہیں اور قومی اسمبلی اسلامی طرز زندگی کو نافذ کرنے میں ناکام رہی ہے۔[46] ضیاالحق اور محمد خان جونیجو سیاسی حریف نہیں تھے لیکن ان کے درمیان اختلافات سیاسی نظام کا حصہ تھے۔ آغاز میں جونیجو نے ضیاءالحق سے ہر موقع پر مشورہ لیا اور ان کا احترام کیا۔ ان کے بعد کے اختلافات ان کی طاقت کی تقسیم کے نظام کی مشکلات کا نتیجہ تھے۔ وزارتوں کو مسلسل ضیاءالحق کے احکامات ملتے رہتے تھے۔ ان کے سٹاف کے سینئر لوگ جلد جوابی کاروائی پر زور دیتے۔ قانون کے مطابق وزارتوں کو وزیراعظم سیکرٹریٹ کے ذریعے جوابات صدر کو پہنچانے ہوتے تھے[47]۔ کسی بھی قسم کی تاخیر ضیاالحق کی ناراضگی کا سبب بنتی تھی۔ اس طرح شکوک وشبہات کی وجہ سے صدر اور وزیراعظم کے درمیان خلیج وسیع ہونے لگی۔ جونیجو نے ضیاءالحق سے کہا کہ وہ تمام احکامات ان کو بلاواسطہ بھیجیں اور وعدہ کیا کہ ان کو جلد نافذ کیا جائے گا، لیکن یہ بات ضیاءالحق کی طبیعت کے خلاف تھی۔ ان باتوں نے تلخی پیدا کی جس سے ان کے قریبی مشیروں نے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے اس سے پہلے کہ جونیجو انہیں سیاسی طور پر کوئی نقصان پہنچائیں[48] ضیاءالحق کو جونیجو کے خلاف قدم اٹھانے کا مشورہ دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دونوں کے درمیان فاصلے پیدا کرنے میں کچھ اور بھی اہم معاملات تھے۔ جونیجو نے صدر ضیاء الحق کی منظوری کے بغیر ہی مارشل لاء کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ یہ شائد جونیجو کا ناقابل معافی جرم تھا۔ جس سے تعلقات میں دراڑ پڑ گئی اور جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وسیع ہوتی گئی[۴۹]۔ قومی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے جونیجو نے اس ضرورت پر زور دیا کہ مزید قانون سازی کے ذریعے پاکستان کو دوبارہ ۱۹۷۳ء کے آئین تک واپس لایا جائے[۵۰]۔ جونیجو کے اس وعدے نے کہ آخری کئی سالوں میں ہونے والی ساری ترامیم کا دوبارہ جائزہ لیا جائے گا بھی انہیں صدر سے مزید دور کر دیا[۵۱]۔ اہم سول اور فوجی افسروں کی تقرریوں اور تبادلے بھی جلد ہی دونوں کے درمیان وجہ نزاع بن گئی۔ جونیجو نے چیف آف نیول سٹاف کی تقرری کو رد کر دیا۔ کیونکہ وزارت دفاع نے ان سے پہلے اس کی اجازت نہ لی تھی۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے ایسے فیصلے تھے جنھوں نے دونوں کے تعلقات پر اثر ڈالا[۵۲]۔ ایک اخبار نویس نے ان فیصلوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۱۔ جونیجو کی مرضی کے خلاف میجر جنرل آغا نیک محمد کو آئی۔ بی کا ڈائریکٹر بنایا گیا۔

۲۔ ضیاء الحق کی مرضی کے خلاف جونیجو نے لیفٹیننٹ جنرل مجیب الرحمٰن کو سیکرٹری اطلاعات کے عہدے سے ہٹا دیا۔ (مجیب الرحمٰن کا یہ حکم کہ جونیجو کی ٹی۔ وی تقریر سے یہ الفاظ ''مارشل لاء اور جمہوریت ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے'' حذف کر دیئے جائیں۔ جونیجو کی ناراضگی کا سبب بنا۔

۳۔ جونیجو نے جنرل کے۔ ایم۔ عارف اور جنرل رحیم الدین کو ملازمت میں توسیع دینے سے انکار کر دیا اور اس طرح جنرل ضیاء الحق کی ناراضگی مول لی[۵۳]۔

ان کے علاوہ کچھ اور وجوہات کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا ہے مثلاً جونیجو نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار دفاعی بجٹ کو کم کرنے کی کوشش کی۔ مئی ۱۹۸۸ء میں ایک فنانس منسٹر نے یہ اعلان کیا کہ گورنمنٹ کی ایک خاص جائزہ کمیٹی تشکیل دی گئی ہے تا کہ دفاعی بجٹ کو کم کیا جائے۔ یہ کمیٹی پارلیمنٹ کے ارکان اور وزارت خزانہ کے سرکاری افسران پر مشتمل تھی۔ اس کمیٹی نے تجاویز دیتے ہوئے کہا کہ ملک میں کم تعداد میں فوج رکھی جائے، شہریوں کو تربیت دی جائے اور نیشنل ڈیفنس کونسل بنائی جائے جو پارلیمنٹ کی سرپرستی میں کام کرے اور دفاعی اخراجات کا جائزہ لے[۵۴]۔ جونیجو کی بجٹ تقریر نے جلتی پر تیل کا کام کیا جس میں اس نے جرنیلوں کو "Royal People" کہا اور مزید یہ کہا کہ:

"we will put them in Suzuki cars"[55]

نتیجتاً ضیاء الحق نے ۲۲ مئی ۱۹۸۸ء کو کہا: "Pakistan cannot afford any cut or freeze in defence expenditure,since you cannot freeze threats toPakistan's security."

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک سیاسی تجزیہ نگار نے لکھا کہ اس ملک میں فوج کا ادارہ اتنا مستحکم ہے کہ ایک سول حکومت اس وقت تک حکومت میں رہ سکتی ہے جب تک کہ وہ فوج کے معاشی مفادات میں مداخلت نہیں کرتی[۵۷]۔

جونیجو نے افغانستان کے معاملے کو بھی ضیاء الحق کی خواہشات کے مطابق حل نہیں کیا۔ حالات اس وقت اور بھی خراب ہو گئے جب جونیجو نے افغانستان کے مسئلے پر ۱۹۸۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس بلائی تاکہ افغان مسئلے پر قومی اتفاق رائے حاصل کیا جائے۔ بے نظیر سمیت ملک کے تمام سیاسی رہنماؤں نے اس میں شرکت کی۔ ضیاء الحق سے نا تو مشورہ لیا گیا اور نہ ہی اس میں شرکت کے لئے ان کو دعوت دی گئی۔ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے دیکھ کر ضیاء الحق میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو گیا۔ جونیجو نے تمام سیاسی رہنماؤں اور ان کی سیاسی سرگرمیوں پر عائد پابندیاں نرم کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۸ء کے دوران سیاسی حلقوں میں جماعتی بنیادوں پر نئے انتخابات کی افواہ گردش کرتی رہتی تھی۔ ضیاء الحق اور ان کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ جونیجو ایک حقیقی وزیر اعظم کی طرح عمل کر رہے ہیں۔ اس سے ضیاء الحق کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں اس نظام کا وجود خطرے میں نہ پڑ جائے جسے انہوں نے بڑی محنت سے تیار کیا ہے[۵۸]۔ اگرچہ افغان مسئلے پر آغاز میں جونیجو نے ضیاء الحق کی پالیسی کو آگے بڑھایا مگر آخر میں انہوں نے جنیوا معاہدہ (۱۴ اپریل ۱۹۸۸ء) میں جلد بازی دکھائی۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ کابل میں مجاہدین کی حکومت بننے سے روس سے زیادہ مراعات لی جاسکتی تھیں[۵۹]۔ ضیاالحق چاہتے تھے کہ جنیوا معاہدے پر عمل نہ کیا جائے اور مجاہدین کی اس وقت تک حمایت کی جائے جب تک کہ وہ نجیب حکومت کو شکست دے کر حکومت حاصل نہیں کر لیتے۔ جونیجو حکومت کی جلد بازی نے کابل میں مجاہدین کی حکو کرے گی[۶۳]۔ نیویارک ٹائم کے ایک تجزیئے کے مطابق جونیجو حکومت نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جنرل اختر عبدالرحمٰن اور جنرل حمید گل کو اس سانحہ کا ذمہ دار قرار دے گی۔ کیونکہ انہوں نے یہ بارودی ڈپو اتنے گنجان آباد علاقے میں قائم کرنے کی اجازت دی۔ کابینہ ان جرنیلوں کو ہٹانے والی تھی کہ ضیاء الحق نے پہلے ہی حکومت کو برطرف کر دیا[۶۴]۔ یہ وجوہات اور وضاحتیں کسی حد تک اس سوال کا جواب دیتی ہیں کہ ضیاء الحق نے جونیجو حکومت کو کیوں برطرف کیا۔ ضیاء الحق کی یہ وضاحت کہ حکومت کرپشن میں ملوث تھی اور نفاذ اسلام کے راستے مت قائم نہ ہونے دی[۶۰]۔

بظاہر جونیجو حکومت کی برطرفی کی سب سے بڑی اور فوری وجہ پنڈی میں اوجڑی کیمپ کا واقعہ ہے۔ اس واقعہ نے ملک کے اندر فوج کے خلاف ناراضگی کی ایک فضاء پیدا کر دی۔ اور عوام کی طرف سے سینئر آرمی افسروں کے احتساب کا مطالبہ زور پکڑ گیا[۶۱]۔ جونیجو نے اس واقعہ کی تحقیقات کے لئے ایک اعلیٰ سطح کی تحقیقاتی کمیٹی قائم کرنے کا وعدہ کیا[۶۲] اور کہا کہ حکومت اس واقعہ کے ذمہ دار کسی بھی شخص کو سزا دینے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں سے ہٹ گئی تھی، ان کے عمل کی آئینی بنیادوں کو مشکوک بناتی ہے[۶۵]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صدر کے قومی اسمبلی توڑنے اور حکومت کو برطرف کرنے کے حکم کو لاہور ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا۔ یہ مقدمہ حاجی سیف اللہ کیس کے نام سے مشہور ہوا۔ حکومت کی طرف سے کہا گیا کہ آئین کے آرٹیکل ۵۸ (۲۔ بی) کے مطابق صدر نے اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اور ان کی ذاتی رائے کے مطابق جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو وہ اسمبلی توڑ سکتا ہے۔ ہائی کورٹ کے پاس یہ اختیار نہیں کہ وہ صدر کی اس صوابدید میں مداخلت کرے۔ ہائی کورٹ نے اس جواز کو تسلیم نہیں کیا۔ عدالت میں آٹھویں ترمیم پر بحث کے دوران ہونے والی تقریروں کو منگوایا گیا۔ خاص طور پر پارلیمنٹ کے اندر وزیر اعظم اور وزیر قانون کی تقریروں کا جائزہ لیا گیا۔ عدالت نے ان تقریروں کی روشنی میں کہا کہ صدر کے صوابدیدی اختیارات پر کچھ شرائط عائد ہوتی ہیں لیکن نہ تو ہائی کورٹ میں اور نہ ہی بعد میں سپریم کورٹ کے سامنے ایسے شواہد پیش کئے گئے جس سے ظاہر ہو کہ وفاقی حکومت چلانا مشکل ہو گیا تھا۔ جس سے آئین کے معمول کے کام میں رکاوٹ آ گئی تھی۔ صدر کی پیش کردہ وجوہات قبول نہیں کی گئیں کیونکہ یہ مبہم تھیں اور کسی بھی صورت حال پر لاگو کی جا سکتی تھیں اور مکمل طور پر ذاتی رائے پر مبنی تھیں۔ لیکن سپریم کورٹ نے اسمبلیاں بحال کرنے سے انکار کر دیا تاکہ لوگ نئے انتخابات میں جماعتی بنیادوں پر اپنا حق رائے دہی استعمال کر سکیں[۶۶]۔

قومی اسمبلی توڑنے سے اور سپریم کورٹ کے فیصلے سے اس بات میں اور بھی وزن پیدا ہو جاتا ہے کہ ضیاء الحق جمہوریت کی بحالی میں مخلص نہ تھے۔ ان کے اس فیصلے سے ان کو اور زیادہ سیاسی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا لیکن اگست ۱۹۸۸ء میں ہوائی حادثے نے انہیں پر وقار انداز میں پاکستان کے سیاسی منظر سے اوجھل ہونے کا موقع دے دیا[۶۷]۔

آٹھویں ترمیم نے چار حکومتوں کا شکار کیا۔ اس کے بعد نواز شریف حکومت نے اپوزیشن کے ساتھ مل کر اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یکم اپریل ۱۹۹۷ء میں تیرھویں ترمیم کے ذریعے آٹھویں ترمیم کے چند آرٹیکلز میں تبدیلی کی گئی۔ ۵۸ آرٹیکل کی شق کو حذف کر دیا گیا۔ اسی طرح صوبائی اسمبلیاں توڑنے کے گورنر کے صوابدیدی اختیارات کو بھی ختم کر دیا گیا۔ آرٹیکل ۱۰۱ میں ترمیم سے صدر پر یہ لازم ہو گیا کہ وہ صوبائی گورنروں کی تقرری میں وزیر اعظم سے مشورہ لے۔ آرٹیکل ۲۴۳۔ ۲ میں بھی فوج کی تقرریوں میں صدر کی صوابدید کو ختم کر دیا گیا۔ اس طرح پارلیمانی نظام کو بحال کر دیا گیا مگر جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اور پاکستان کے معاملے میں یہ بات زیادہ درست ثابت ہوتی ہے کہ ایک بار پھر ایک وزیر اعظم کی ناعاقبت اندیشی ملک کو مارشل لاء کی طرف لے گئی۔ درحقیقت خرابی کسی نظام میں نہیں ہے۔ تمام نظام ہی دنیا کے کسی نہ کسی ملک میں کامیابی سے کام کر رہے ہیں۔ خرابی صرف ہمارے لوگوں میں ہے جن کو جب اقتدار ملتا ہے تو وہ خود کو عقل کل سمجھتے ہوئے فاش غلطیاں کرتے ہیں۔ بلکہ ماضی کے حکمرانوں کی غلطیوں سے سبق سیکھنے کی بجائے ان کو دہراتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان ۵۰ سال کے بعد بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلسل اسی ایک دائرہ میں گردش کر رہا ہے اور ہم ابھی تک اپنے لئے کوئی سیاسی نظام وضع نہیں کر سکے۔ اگر ہم بھی نظام کے ساتھ مخلص ہوں گے تب ہی وہ نظام اس ملک میں کامیابی کے ساتھ چل سکتا ہے۔ لیکن ہمیں اب یہ بات سمجھ جانا چاہیے کہ ترامیم کسی برائی کا راستہ نہیں روک سکتیں ہمیں خود کو اندر سے بدلنا ہوگا اگر ہمارا مزاج جمہوری ہوگا تب ہی اس ملک میں جمہوریت ایک سیاسی نظام کے طور پر کامیابی سے چل سکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ Sartaj Aziz, "8th Amendment:The Real Issues, " **The Nation**,5th Feb.,1989

۲۔ Hassan Abbas,**Poleaxe or politics of Eighth Amendmendt**,(Lahore:Watondost,1997),7.

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

۶۔ Hamid Yusuf , **Pakistan in search of Democracy**,1947-77(Lahore:Afrasia Publications,1980),136.

۷۔ سرتاج عزیز، بحوالہ سابقہ

۸۔ ایضاً

۹۔ Malik Muhammad Akhtar,"**Eighth Amendment-IV**: Constitutional Protection for Martial Law Action, "**The Pakistan Times**" ,18th Feb,1989.

۱۰۔ عباس، بحوالہ سابقہ، ۵۵

۱۱۔ Haque Rod and Martin Harrop, **Comparative government and Politics**(London:Macmillan,1982),221.

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ عباس، بحوالہ سابقہ، ۷۷

۱۴۔ Haque Rod,Comparative Givernment,227

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ Asif Saeed Khan Khosa,"Constitutional Powers of the President-1,"**The Nation**",30 Sep,1996.

۱۷۔ یہ آرٹیکل ہیں۔۴۸(۵)، ۴۶، ۴۸، ۱۰۵(۴)، ۲۱۳(۱)، ۲۴۲(a)، ۲۴۳(۲c)، ۵۶، اور ۵۸۔

۱۸۔ کھوسہ، بحوالہ سابقہ، ۱

۱۹۔ ظفر محمود ملک، **آٹھویں ترمیم مارشل لاء کا تاوان**، (لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۳ء)، ۸۴

۲۰۔ Mohammad Ilyas, " **8th Amendment:An Analysis**" " **The Nation**" ,4th May 1989.

۲۱۔ Adil Ahmad, **"The Eighth Amendment** : A commentary,14 cited in Abbas,Poleaxe or Politics of Eighth Amendment,48.

۲۲۔ **Federation of Pakistan** vs.Muhammad Saifullah khan , All **Pakistan Legal Decisions**,vol.XCI,No.4,April 1989,sc.181.

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ ظفر محمود ملک، **آٹھویں ترمیم**۔۔ مارشل لاء کا تاوان، ۵۲

۲۵۔ ایضاً، ۴۶

۲۶۔ ایضاً، ۹۱

۲۷۔ **The National Assembly Debates official report**,vol.IV,No.24,Monday,4thOct,1985,3224

۲۸۔ ایضاً

۲۹۔ Ambreen Zaman," Shadow of the 8th Amendment" ,**The Frontier Post**,23rd May,1992.

۳۰۔ فاروق حسن، نوائے وقت، ۱۳ مارچ ۱۹۹۳ء

۳۱۔ عباس، بحوالہ سابقہ، ۷۰

۳۲۔ Safdar Mahmood,**"The Rise and Fall of M.K.Junejo"**.**The News**, 25th March,1993.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۳۔ Mohammad Waseem, **Politics and State inPakistan**,(Islamabad: National Institute of Historical and Cultural Research,1994,399.

۳۴۔ صفدر محمود، بحوالہ سابقہ

۳۵۔ ایضاً

۳۶۔ ایضاً

۳۷۔ ایضاً

۳۸۔ Eliza Van Hollen, : **Pakistan in 1986**:Trails of Transition, Asian Survey ,vol:XXVII,No,2.(February,1987)),144.

۳۹۔ ایضاً،۱۴۵

۴۰۔ صفدر محمود، بحوالہ سابقہ

۴۱۔ Rasul Bakhsh Rais," **Elections , Regime, Change and Democracy, "Rais(ed) State,Society and Democratic Change in Pakistan**,255

۴۲۔ ایضاً،۲۵۶

۴۳۔ K.M.Arif,**Working With Zia**:Pakistan's Power Politics 1977-88(Karachi:Oxford University Press), 236

۴۴۔ ایضاً،۲۳۷

۴۵۔ حسن محمود، بحوالہ سابقہ

۴۶۔ ایضاً

۴۷۔ ایضاً

۴۸۔ کے۔ ایم۔ عارف، بحوالہ سابقہ،۳۹۲

۴۹۔ ایضاً،۹۳۲

۵۰۔ صفدر محمود، بحوالہ سابقہ

۵۱۔ **The Nation**,14 March,1987

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵۲۔ **The Frontier Post**,14 March,1987

۵۳۔ عباس، بحوالہ سابقہ، ۸۴

۵۴۔ **جنگ**، ۵، مارچ ۱۹۹۳ء

۵۵۔ Mushahid Hussain and Akmal Hussain,**Pakistan:Problems of Governance**,Lahore:Vanguardbokes,1993,93.

۵۶۔ ایضاً

۵۷۔ ایضاً

۵۸۔ Makhdoom Ali Khan,**1973 Constitution : The Founding of the Federation,** cited in Hassan Abbas,op.cite., p.86.

۵۹۔ رسول بخش رئیس، بحوالہ سابقہ، ۲۵۷

۶۰۔ ایضاً

۶۱۔ **The Pakistan Times**,19th April,1988

۶۲۔ **The Muslim**, 6th June,1988

۶۳۔ **The New York Times**,13th June,1988,cited in Hassan Abbas,op.cite,p 85.

۶۴۔ **The Dawn**,9th October,1988

۶۵۔ کے۔ ایم۔ عارف، بحوالہ سابقہ، ۳۱۲

۶۶۔ **Federation of Pakistan** vs.Muhammed Saifullah Khan, All Pakistan Legal Decissions,vol.xli,p.180.

۶۷۔ **The Dawn,**18th Aug,1988.

© rasailojaraid.com